Oriental College Magazine, Vol.102, No. 01, Serial No. 383, 2026

اُردو فکشن میں کربلائی عناصر کی پیش کش

ربیعہ ابرار، پی ایچ ڈی

ایم فل اسکالر اُردو، شعبہ اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

شاہد نواز، پی ایچ ڈی

ایسوسی ایٹ پروفیسر اُردو، شعبہ اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

PRESENTATION OF KARBALAI ELEMENTS IN URDU FICTION

Rabea Abrar
MPhil Scholar Urdu, Sargodha University, Sargodha
Shahid Nawaz, PhD
Associate Professor of Urdu, Sargodha University, Sargodha

Abstract

The Occurrence of Karbala is an extraordinary event in history which has had an indelible political, social, and cultural impact on the history of the Muslim Ummah and this event teaches a lesson to resist oppression, and tyranny, so this event not only It became a symbol of determination, courage and bravery, but also a metaphor of self-sacrifice. As literature is a social formation, therefore the events of Karbala have also become its subject. In Urdu literature, the strong tradition of expressing the event of Karbala in poetry in the form of "Marsiya" and "Salam". In Urdu fiction, Fiction writers have also included the karbala event along with its elements as an subject matter of their works. The event of Karbala is a historical and religious matter, and Fiction writer also explores and presents history at the level of probabilities. Therefore, most fiction writer have made the event of Karbala a direct subject. And many fiction writers have taken the elements of Karbala on a metaphorical and symbolic level, while its social and cultural formation have also been made as an subject. So Many fiction writers have been presented in the fictional literature related to the above topic. Therefore, the Event of Karbala appears to play a role in all genres of fiction, Dastan, novel, short stories and in drama.and they also convey their ideas effectively through krbala.

Keywords:
Impact of Karbala, Karbalai Elements, Values, Socio-Culture Formation, Metaphorical And Symbolic Expression, Dastan, Novel, Short Story, Drama, overall review

۱۰ محرم ۶۱ ہجری کو سر زمین کربلا، عراق پر پیش آنے والے واقعے کی معنویت کا یہ اختصاص ہے کہ وہ اپنی تاریخی، مذہبی، سماجی، مزاحمتی، انسانی ہمہ گیریت کے سبب آج تک نہ صرف فراموش نہیں کیا جا سکا بلکہ نئی معنویت اور سماجی جڑت کے ساتھ اساطیری حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس لیے اس واقعے سے محسوساتی وابستگی کا اظہار آج بھی متنوع صورتوں میں کیا جاتا ہے۔ اس واقعے کے اثرات دنیا بھر میں بالعموم اور مسلمانوں کے ہاں بالخصوص واضح طور پر موجود ہیں۔ ہندوستان کی سماجی و ثقافتی زندگی پر مسلمانوں کی آمد کے بعد واقعہ کربلا اور اس سے جڑی جزئیات نے متنوع اثرات چھوڑے ہیں۔ مسلمان اگر واقعہ کربلا کی مذہبی اور تاریخی حیثیت کو گلے لگائے ہوئے ہیں، تو دیگر مذاہب کے لوگ اس واقعے اور اس سے جڑے کرداروں کی خصوصیات کو نہ صرف ستائش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بلکہ واقعہ کربلا سے جنم لینے والی اقدار اور اوصاف کو اپناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یوں متحدہ ہندوستان اور بعد ازاں پاکستان میں واقعہ کربلا کی سماجی اور ثقافتی معنویت بہت گہری ہو چکی ہے۔ واقعہ کربلا اسلامی تاریخ کا وہ پہلو ہے، جس نے ہندوستان کی سماجی و ثقافتی اقدار کی تشکیل میں نہایت مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

ہندوستان میں مختلف زبانوں کے ادب خصوصاً اردو ادب میں واقعہ کربلا اپنی جزئیات اور ادبی تشکیل سمیت موجود ہے۔ کربلا کی اردو ادب میں پیشکش کے مطالعے کی صورت بھی متنوع ہے۔ شاعری ہو یا فکشن دونوں نے اپنے موضوعات میں بطور خاص کربلا کے واقعے اور اس کی جزئیات کو برتا ہے۔ کربلا کی تاریخ جو شعور انسان کو عطا کرتی ہے، وہ حق شناسی، ایثار، قربانی، عزم و استقلال، شجاعت و بہادری، تسلیم و رضا، عزت و حماسہ، پیکان وفا کا، باطل کے خلاف مزاحمت کا، آزدی و فکر کا خلوص و محبت کا، اخوت و ہمدروی کا، انصاف پسندی اور حریت پسندی کا ہے۔ یہ وہ تمام قدریں ہیں جن کے بغیر نہ تو کوئی اعلیٰ تہذیب پروان چڑھ سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اعلیٰ ادب تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کربلا سے جڑی ان بالا قدروں کی اُردو ادب میں بھی ترجمانی دیکھی جا سکتی ہے۔ کہیں براہ راست کربلا اور جزئیات کربلا کے ذریعے تو کہیں علامتی و بلواسطہ ترجمانی کی گئی ہے۔ اُردو کی ادبی تاریخ میں بطور خاص مسلم شعرا اور ادبا نے ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستانی ادیبوں نے واقعہ کربلا کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ شاعری میں پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ سے لے کر میر و سودا تک، سودا سے لے کر داغ دہلوی تک، داغ دہلوی سے لے کر اقبال تک اور پھر اقبال سے ترقی پسند شاعری میں بھی فیض احمد فیض کے ہاں اور ان کے بعد جدید شعرا اور مابعد جدید شعرا کے ہاں بھی واقعہ کربلا کی پیشکش ملتی ہے۔ جہاں سلام و مرثیہ و نوحہ میں براہ راست اس واقعہ کو پیش کیا گیا

ہے وہیں غزلوں میں علامات اور استعاروں کی مدد سے بلواسطہ اظہار کیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر نثری اصناف میں بھی واقعہ کربلا کا جائزہ لیا جائے تو ابتدائی نثری جہتوں سے لے کر داستانوں، ناولوں، ڈراموں، افسانوں تک واقعہ کربلا ہر صنف میں اپنا اثر دکھاتا نظر آتا ہے۔ پریم چند، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، انتظار حسین اور حسین الحق کے ہاں براہ راست اظہار پایا جاتا ہے جب کہ بلواسطہ طور پر بھی بہت سے ادیبوں نے اس واقعہ کو پیش کیا ہے۔ رتبہ در رتبہ علامتی طور پر برتا گیا ہے۔ نئے معنیاتی تقاضوں کے تحت عصری حالات کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے۔

> فنکار یا شاعر تاریخ کی عظیم روایتوں کی بازیافت بھی کرتا ہے اور ان سے نیا رشتہ بھی جوڑتا ہے۔ نیز پرانی اور تاریخی سچائیوں کو نئی روشنی میں پیش بھی کرتا ہے جس کی اس کے عہد کو ضرورت بھی ہوتی ہے۔(۱)

تاریخ کا یہ واقعہ بھی اپنے کرداروں و عظمت کی وجہ سے نثری اور شعری رویوں میں اظہار پا رہا ہے۔ ایک تخلیق کار اپنے ماضی کے ورثے جس میں اس کے اسلاف اور اجداد کے کارنامے ہوتے ہیں انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ محسوساتی اور جذباتی سطح پر ان سے جڑا رہتا ہے۔ اسی طرح واقعہ کربلا بھی ہمارے دلوں میں ماضی کا ورثہ ہے جسے مختلف شکلوں اور اساطیر کی صورت میں پیش کرنے کا رجحان بھی عام ہے۔ اسی لیے واقعہ کربلا کے اساطیری حوالے بھی فکشن میں ملتے ہیں۔ کربلا کے کردار بطور علامت کے سامنے آتے ہیں حق کی علامت سیدنا امام حسین وفاداری حضرت عباس جب کہ یزید بدی کی علامت، یعنی کوئی ہونا، حسینی ہوتا، زینبی ہونا، عباسی و علمداری ہونا، یزید کی ہونا، حُر ہونا، شمر ہونا سب تاریخ اور ادب و فن میں یہ استعارے بن گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مشکیزہ، دشت، پیاس، تیر، سجدہ، شام غریباں، فرات کا ساحل، العطش کی صدائیں، نیزے پر سر، فوج شام تمام ادب اس طرح کی علامتوں، استعاروں، تلمیحات، تراکیب سے بھرا پڑا ہے۔ چاہے کسی ناانصافی و سیاسی جبر و استحصال یا نو آبادیاتی تناظر میں دیکھیں تو یہ موضوع وسیع معنی رکھتا ہے۔ اس کا حوالہ نہ صرف مذہبی، تاریخی روایت سے ہے بلکہ یہ وسیع معنوں میں عالمگیر آفاقی موضوع ہے۔ تخلیق کار اپنے تخیل میں آزاد ہے تو اس کا ذہن بنیادی طور پر اپنی مذہبی ثقافتی روایتوں سے فیض حاصل کرتا ہے۔ جس طرح صلیب کی علامت پوری دنیا کے ادب میں مستعمل ہے تو یہ صرف عیسائیوں کے لیے نہیں بلکہ ہر دکھ جھیلنے والے کے لیے علامت بن گئی ہے۔ چوں کہ فن خود حقیقت کی تخلیق ہوتا ہے اسی طرح واقعہ کربلا بھی تمام عالم انسان کی عمومی صورت حال پر اطلاق کیا جا سکتا ہے جس

کا خوبصورت اظہار فکشن میں بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کربلائی عناصر کی سماجی تشکیل کا اظہار بھی ملتا ہے۔

کیونکہ رسم ورواج ہماری تہذیبی و ثقافتی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں جس کے وسیلے سے کسی بھی سماج کے مزاج سے واقفیت ہوتی ہے اور اُس مزاج کے بننے میں بھی تاریخی واقعات، صدیوں کے تجربات اور مشاہدات بھی نظر آتے ہیں۔ اسی طرح بعض رسمیں مذہبی نظریات کی بدولت بھی جنم لیتی ہیں۔ واقعہ کربلا کا بھی ہماری سماجی و ثقافتی تشکیل میں اہم کردار ہے۔ محرم کے رسم ورواج، نذر و نیاز، ذوالجناح، مرثیہ خوانی، علم نکالنا، سینہ کوبی، شب بیداری، سبیل کی رسم یہ وہ مذہبی نظریات ہیں وواقعہ کربلا سے نجڑے ہیں۔ توہمات، عقید میں، رسم ورواج، معتقدات جو اس واقعے کے ساتھ وابستہ ہیں اور ہماری سماجی زندگی کا حصہ ہیں۔ تو تخلیق کار جو انسانوں کے درمیان زندہ ہے اپنی زندگی بسر کر رہا ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ ان کے عقیدوں، رسموں، جذبات، رنج و غم کے اتار چڑھاؤ سے اثر نہ لیتا ہو۔ یہی فنکار کی تہہ ہی گرفت ہے جو اس کی تخلیق میں جھلکتی ہے۔ اسی لیے فکشن میں بھی کربلائی عناصر کی سماجی تشکیل کے حوالے سے بھی مستحکم روایت ملتی ہے۔

کہانی کی جڑت چونکہ انسانی زندگی سے ہے اور حیات انسانی ہی کہانی کی ضامن ہے اس لیے سماجی اور تاریخی ارتقا کے ساتھ ہی کہانی بھی ارتقائی سفر طے کرتی ہے۔ عصری، تہذیبیں معاشرت کے ساتھ عشق وعدل، خیر وشر، تقدیر و تدبیر اور مختلف مہمات جیسے موضوعات کی پیش کش ملتی ہے۔ اردو داستانوں کی ابتدائی جنتوں کا اگر مطالعہ کریں تو پہلی قابل ذکر نثری تصنیف ملا وجہی کی "سب رس" ہے۔ یہ ایک تمثیلی قصہ ہے۔ وجہی نے معاشرتی مسائل، مذہب، تصوف کے اسرار ورموز پر، عشق و عقل کی تعریف، آب حیات کے بارے میں مباحث پیش کیے ہیں۔ واقعہ کربلا بھی عشق کا معاملہ ہے۔ کیونکہ اس کا بنیادی عنصر مہر و عطوفت و عشق و محبت ہے۔ جہاں عاشق اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر کے بے خوف وخطر میدان کارزار کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ دوسری طرف یزید ہوس پرست اور عقلیت کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ”سب رس“ میں بھی دو بادشاہ عقل اور عشق ہیں جن کے بیچ حسن و دل مرکزی کردار ہیں۔ عشق مشرق کا بادشاہ ہے۔ اسے عقل اور دل کی لشکر کشی کی اطلاع ملتی ہے خود مقابلہ کرنا کسر شان سمجھتا ہے۔ اپنے سالار کو بھیج دیتا ہے۔ مگر عشق کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور بالا آخر عقل کو عشق کی ماتحتی قبول کرنا پڑتی ہے:

> عشق اور مقتل کی جنگ ماضی تا حال جاری ہے اس نے قوموں کی تاریخ کو نئے عنوان دیے ہیں۔ جماعتوں کی زندگی اور موت کے فیصلے کیے ہیں۔ فرد کے سامنے آزمائش کی لمبی لکیریں کھینچی ہیں۔(۲)

عقل اپنے مقاصد کی بر آوری کے لیے دوسرے کا خون بہانے سے گریز نہیں کرتی جبکہ عشق اپنی آزمائش کرواتا ہے۔ یہ عنصر بلواسطہ طور پر واقعہ کربلا کے پس منظر کے طور پر کام آرہا ہے۔ وہ جنگ بھی عشق، عقل اور ہوس پرستی کے درمیان تھی اور عشق کامیاب ٹھہرا تو یہاں بھی مصنف کا عقل کو عشق کے ماتحت بنانا اُس کی شعوری کاوش کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ دکن میں اردو کی قابل ذکر منثور داستان ہے۔

کربل کتھا شمالی ہندوستان میں اُردو نثر کے ابتدائی فروغ میں جہاں اہمیت کی حامل ہے وہیں یہ براور است واقعہ کربلا کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب "روضتہ الشہدا" مجالس عزا میں سنائی اور پڑھی جاتی تھی۔ اور یہ فارسی زبان میں تھی جس کی وجہ سے لوگ سمجھ نہیں پاتے تھے اور پرسہ دینے کے ثواب سے محروم رہتے تھے۔ جس پر وہ افسوس کرتے اور اس خواہش کا اظہار کرتے تھے کہ کوئی اس کے متن کو عام فہم کر کے سمجھائے۔ اس ضرورت کے پیش نظر فضلی نے "روضتہ الشہدا" کا ترجمہ کیا۔ داستانوی رنگ میں لکھا گیا یہ تاریخی واقعہ برصغیر کے ماحول کو پیش کرتا ہے۔ پوری کتاب میں برصغیر کا ماحول اور تہذیبی رنگ چھایا ہوا ہے۔ غم، اداسی، تکالیف، صبر و سوز، مستورات اور بچوں کو قید کیا گیا اور چہلم کے واقعات کو مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس کا مقصد بھی اطمینان قلوب تھا۔ مجلسی اور مذہبی دونوں ضرورتوں کو پورا کرتا تھا کربل کتھا اُردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فضلی کی اس نثری تالیف کے ستر اسی برس بعد تک کوئی ایسی تخلیق اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ شاعری کے میدان میں تو بہت لکھا گیا لیکن نثر میں کربل کتھا کے بہت سال بعد حیدر بخش حیدری جو فورٹ ولیم کالج کے بلند پایہ ادیب تھے انھوں نے بھی ملا حسین واعظ کاشفی کی "روضتہ الشہدا" کا ترجمہ "گلشن سیداں" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب اب نایاب ہے مگر انھوں نے مولوی حسین علی جونپوری کے کہنے پر اس کتاب کا خلاصہ گل مغفرت کے نام سے کیا۔ اس کتاب کی ترتیب بھی وہی ہے جو وہ مجلس کی ہوتی ہے۔ سولہ مجلسوں پر مشتمل ہے۔ عشرہ محرم الحرام کے بعد چہلم کی مجالس کا بیان بھی ہے۔

یہ اردو نثر کی ابتدائیں جہتیں ہیں کہ جن میں واقعہ کربلا کا بلواسطہ بھی اور براور است اظہار کیا گیا ہے۔ آگے بڑھیں تو باغ و بہار میں بھی جگہ جگہ سخاوت، امت، شجاعت، حق و باطل میں تمیز اور غیر اسلام کو باطل قرار دینے کے تصورات ملتے ہیں۔ رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" جو لکھنوی زندگی کا مرقع پیش کرتی ہے اس میں مذہب کی کچی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لکھنوی چونکہ عقیدتاً شیعت مذہب کے معتقد تھے۔ ان کے عقائد، رسوم ورواج، خاص کر محرم الحرام کی رسومات اور وہاں کے معتقدات کا بیان بہت دلچسپ ہے۔

بجز غم حسین شہریار کو اندوہ غم نہیں۔ کون ہے جو اس زمانے میں شاد و خرم نہیں، اربعین تک عزاداری ہوتی ہے ہے۔ خلق خدا ماتم حسین میں روتی ہے۔ لاکھوں روپیہ اس راہ میں صرف ہوتا ہے۔(۳)

لکھنو کی عیش و عشرت کی فراوانی مذہب سے دور نہیں کرتی بلکہ وہی دولت و ثروت، مذہبی رسوم پر بھی صرف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ لکھنو کے لوگوں کے اعتقادات کو بھی بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔

عورتیں گریہ وزاری کرتی ہیں۔(۴)

کربلائی کردار چونکہ ہمت و عظمت و شجاعت کا استعارہ ہیں اور مسلمان اس بات کے معتقد بھی ہیں۔ ان کے توسل سے مشکلات دور ہوتی ہیں تو جب بھی یہ کردار کسی مشکل میں گرفتار ہوتے ہیں تو کربلا سے جڑے کرداروں سے معجزاتی طور پر مشکل کشائی کے لیے امداد طلب کرتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک مثال فدا علی عیش لکھنو کی داستان "فسانہ دلفریب" میں بھی ملتی ہے جب فریدوں حشمت کی واپسی پر منتیں مانی جاتی ہیں۔ چونکہ حضرت عباس علمدار کو باب الحوائج کا لقب دیا گیا ہے یعنی کوئی حاجت روا ان کے در سے خالی نہیں جاتا تھا۔ اس لیے جابجا حضرت عباس علمدار کے توسل سے مرادیں اور منتیں اٹھائی جاتی ہیں۔

داستان امیر حمزہ خیر و شر کی جنگ ہے جس میں نیکی اور بدی آپس میں برسرپیکار ہیں۔ دونوں کو ہی طلسمات اور معجزات کی مدد حاصل ہے۔ لیکن فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ نیک، پاکیزہ اور حق پرست کردار چونکہ ہماری خواہش کا استعاراتی اظہار ہوتے ہیں اور پھر داستان گو ان کو تمثیلی صورت میں پیش کرکے مثالی کردار بنا دیتے ہیں۔ واقعہ کربلا بھی خیر و شر کی جنگ تھی۔ سیدنا امام حسین اور ان کے ساتھی شر جیسی قوتوں سے برسرپیکار تھے۔ اسی طرح امیر حمزہ اور ان کے ساتھی بھی جذبہ ایثار سے سرشار، شر، بُرائی، کافروں اور بہت سی آفات اور مشکلات سے دوچار رہے۔ اس داستان کا موضوع بھی کفار کے ساتھ ملتا ہے اور اسلام کی فتح مندی کے گرد گھومتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی داستان امیر حمزہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> داستان کا بنیادی موضوع شوکت دین حق کو بیان کرنا ہے۔ داستان میں اسلام اور خدا پرستی کا ذکر بہت ہے۔ کہیں کہیں ہندو مذہب کا ذکر داستان میں ضرور ہے لیکن ہندو مذہب کو اسلام کے خلاف صف آرا نہیں دکھایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اسلام کو برحق اور باقی مذہب کو باطل ضرور قرار دیا گیا ہے۔(۵)

داستان میں جابجا کربلائی حوالے ملتے ہیں۔ پیاس، تشنگی کی شدت کو ہو بہو فرات کے کنارے

دسویں محرم کی عکاسی کی گئی ہے۔ جب امیر بیعت ملک کی طرف روانہ ہوتے ہیں تین روز کا پانی پکھالوں میں بھر والیتے ہیں لیکن تین دن کے بعد پانی ختم ہو جاتا ہے۔ لشکر تشنگی کے سبب بے تاب ہو جاتا ہے اور امیر کی زبان میں بھی شدت، تشنگی کے سبب کانٹے پڑ گئے ہیں اور پھر اس موقع پر اگر پانی فراہم ہوتا ہے تو امیر کے ساتھیوں کا اپنے امیر سے وفا کرنا، وفاداری حضرت عباس کو روز عاشورہ فرات کے کنارے سیدنا امام حسین سے وفاداری کے جذبے کو پس منظر میں رکھ کر ابھارا گیا ہے۔

> مقبل کو دے کر کہا تمہاری پیاس بجھنے کے لائق ہے یہ پانی ہے تم پیو، مقبل نے تجویز کیا وفاداری کے خلاف ہے امیر کے لب تو خشک رہیں اور میرے لب تر ہوں۔(۶)

گویا ہماری داستانیں صرف وقت گزاری کا ہی نہیں اور طلسمات کی دنیا میں سکون تلاشنے کا ہی نہیں بلکہ ان میں وہ تصورات اور اخلاقی اقدار نظر آتی ہیں جو جانبازی، سخاوت، فیاضی، حق گوئی، حق شناسی کا درس دیتی ہیں۔ آرائش محفل میں بھی حاتم کی سات مہمات سے ہی کسی نصب العین پر توجہ مرکوز کرنے کا درس بھی ملتا ہے، گویا وہ تمام کربلائی عناصر جو ہماری سماجی ثقافتی تشکیل کا حصہ ہیں۔ ادب میں بھی اس کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ناول بھی داستان کی طرح افسانوی ادب کی اہم صنف ہے۔ ناول جدید دور اور مخصوص طبعیاتی سماج کی پیداوار ہے۔ ناول کو کہانی کی ہی ایک ارتقائی صورت کہہ سکتے ہیں، جس کی بنیاد داستانوی کہانیوں کی بجائے حقیقت نگاری پر ہوتی ہے اور جس کا وصف انسانی زندگی کی براہ راست ترجمانی کرنا ہے۔

> ناول کی تمام تر کوشش زندگی کو بھرپور طریقے سے پیش کرنے پر مرکوز ہوتی ہے اور چونکہ زندگی کی کوئی حد بندی نہیں کی جا سکتی ہے اس کو محدود نہیں کیا جا سکتا اس لیے ناول کی بھی کوئی جامع اور مانع تعریف نہیں کی جا سکتی۔(۷)

ناول انسانی زندگی کو اگرچہ طبعیاتی بنیادوں پر پیش کرتا ہے، مگر مابعد الطبعیاتی اثرات سے کلی طور پر پیچھا نہیں چھڑوا سکتا۔ اس لیے جہاں اردو ناول دیگر موضوعات کو پیش کرتا ہے تو وہاں یہ کیسے ممکن تھا کہ واقعہ کربلا جیسے اہم موضوع پر نظر نہ پڑی ہو۔ واقعہ کربلا اور قربانی سیدنا امام حسین نے بہت سے ادبا کو ادب میں پیش کرنے کی تحریک دی ہے۔ ناولوں میں بھی جا بجا اس فکری عناصر کے حوالے ملتے ہیں جیسے علامہ راشد الخیری نے سماجی و اصلاحی ناولوں کے ساتھ تاریخی ناول بھی لکھے ہیں۔ اُن کے تاریخی ناولوں کا مقصد بھی جہاں تاریخ اسلامی سے واقفیت دلانا تھا تو دوسری طرف عورت کے کردار کو بھی نمایاں طور پر پیش کرنا

تھا کیوں کہ عورت ان کے افسانوں اور ناولوں سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ عورت کو ایک طاقت ور روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسلامی امور سے واقفیت دلا کر مذہبی تعصبات کے حوالے سے غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتے تھے۔ عروس کربلا میں حق اور باطل کی کشمکش کو بیان کرتے ہیں جس نے پورے اسلام میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اسی طرح "سیدہ کالال" بھی دو حصوں میں منقسم ہے پہلا حصہ واقعہ بائلہ کے رونما ہونے کی وجوہات اور دوسرا امیدانِ کربلا میں جنگ کے مناظر کو پیش کرتا ہے۔ سیدنا امام حسین کے قاتلوں اور پشت پناہوں کے انجام تک بحث کی گئی ہے۔ "سیدہ کی بیٹی" میں واقعہ کربلا میں فرض شناس خواتین کے صبر اور شجاعانہ جہاد نے دین کے تحفظ اور پاسداری میں اور مشن سیدنا امام حسین کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ تاریخ بشریت کے اہم کردار جناب زینب کو ابھار کر اپنے بھائی کی ہمراہی اور دربار یزید میں بھی عزم و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرتے دکھایا گیا ہے جو عصری دور میں بھی خواتین کے لیے باعث تقلید ہے۔ ناولوں میں تاریخی و تہذیبی روایات بھی ملتی ہیں۔ ہند اسلامی کا بھی جب مطالعہ کیا جائے تو ان میں تہواروں کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ مختلف مذہبی رسوم اور تہواروں کو بڑی محبت اور عقیدت سے منایا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی کہانیوں میں بھی ان تہواروں کا ذکر وہاں کے ثقافتی پس منظر میں کیا جاتا ہے۔ سرشار نے فسانہ آزاد میں لکھنو کے محرم الحرام اور چہلم کے بیان میں لکھنوی عقیدت مندی کو ظاہر کیا ہے۔

> گھر گھر شیون و شن، گھر گھر بکا و چین، گریہ زاری، اشکباری، جم غفیر، مجمع کثیر ایک تن چلے بول اٹھے اور کیوں نہ ہو مجالس عزا کی دھوم دھام ہے لکھنو کا محرم الحرام ہے لکھنو کی سوز خوانی، لکھنو کی خوش بیانی، لکھنو کی عزاداری، لکھنو کی سوگواری از شام تا روم مشہور ہر مز بوم ہے تعزیہ خانوں میں دھوم دھام امام باڑوں میں ہجوم ہے۔(۸)

محرم کے ایام میں لکھنو میں کوئی مقام ایسا نہیں جہاں نوحہ خوانہ، عزاداری، تعزیہ داری نہ ہوتی ہو۔ اس میں امیر وغریب اور شاہ و گدا بلا تفریق شریک ہوتے تھے۔ وہاں کے اکثر حکمران بھی عقیدتاً اس عقیدے کے معتقد تھے۔ چہلم کے بیان میں بھی نوابین کی عزائے حسینی کو اپنی سرپرستی میں کروانے کا بھی بیان ملتا ہے۔

واجد علی شاہ کے آخری دور میں جب لکھنو کا تہذیبی زوال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ لیکن ابھی مکمل سامراجی قبضہ نہیں تھا۔ پھر بھی جس طرح وہ مٹتی ہوئی تہذیب پر رنجور ہیں کہ ایک شخص آہ سرد کھینچ کر کہتا کہ اب وہ محرم کہاں؟ لکھنو کا محرم رنگیلے پیا جان عالم کے وقت میں دیکھتا تو ارنی گوئے اوج طور بھی

پیش کرتا، اونی آدمی ہزاروں لٹاتے تھے یعنی کہانی کار صرف یک ترقی تصویر پیش نہیں کر رہا۔ محرم الحرام چوں کہ لکھنو کی ثقافت کا ایک خاص جز تھا تو وہ مجالس محرم نذ و نیاز کی ہی مناسبت سے سامراجی طاقتوں کے ہاتھوں ماضی کی ملتی ہوئی تہذیبی زندگی کے امکانات کو بھی پیش کر رہے ہیں۔

"امراؤ جان ادا" میں بھی محرم کی رسومات کے حوالے جابجا ملتے ہیں۔ اس ایک کردار کے ذریعے ہم اس عہد کی پوری تصویر کو دیکھ سکتے ہیں کیونکہ رسوا نے طوائف کے ذریعے پورے لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کو سمیٹ دیا ہے۔ طوائفوں کا ہر محفل میں خواہ شادی بیاہ کی ہو، نجی محفلوں، نذر و نیاز کی اور سوز خوانی کا موقع ہو یعنی تمام مذہبی رسوم میں بھی اور نجی محافل میں بھی ان کی شرکت ضروری ہوتی تھی۔ ایام عزا میں پورے لکھنو میں سوگوارانہ فضا ہوتی تھی جس میں ہر طبقہ محرم الحرام کے احترام کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہوتا تھا۔ بغیر فرقہ کی تمیز کے سیدنا امام حسین کے ساتھ عقیدت اور جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے تھے۔ نذر و نیاز کرتے تھے اور حزن و غم کی کیفیت ہوتی تھی۔

قرۃ العین حیدر کے ناول "چاندنی بیگم" میں ہندوستانی کلچر خصوصاً لکھنو، کلکتہ، بمبئی کی جابجا تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شیعی عقائد، مذہبی رواداری، لوک گیت، جوگیوں کا ماتم، نوحوں، سوز خوانی، منتوں اور تعزیروں کا بیان ملتا ہے۔ کربلا سے جڑی اساطیر کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ راتوں کو دور سے حسینی باجوں کی آوازوں، تعزیوں سے لدی بیل گاڑیاں، نذر و نیاز کا اہتمام، شہرت نامہ پڑھنے کا بیان جگہ جگہ ملتا ہے۔ احسن فاروقی کے ناول "شام اودھ" میں بھی محرم الحرام کی مجالس کا ذکر بڑی باریک بینی سے کیا گیا ہے اور معاشرتی نفسیات بھی دکھائی گئی ہیں۔ "شام اودھ" ناول اودھ کی تہذیبی زندگی کا نمائندہ ناول ہے، جہاں یہ تاریخ اور تہذیب کو پیش کر رہا ہے وہیں اس کو رومانوی ناول کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اودھ کے رسم و رواج، قصر القضا کا ماحول، سماجی اور معاشرتی محفلوں اور معاشقوں کا بیان ناول کو آگے بڑھانے میں مدد دے رہا ہے۔ محرم کی پہلی شام سے ہی نواب صاحب تعزیہ نکلواتے اور سوز خوانی شروع ہو جاتی تھی۔ سات محرم کو مہندی شہزادہ قاسم کی بڑی شان سے اُٹھتی تھی۔ رات میں خاص زنانہ مجلس ہوتی اور قلعوں میں پردہ کروایا جاتا۔ عصمت چغتائی کا ناول "ایک قطرہ خون" براہ راست سانحہ کربلا کی تاریخی کہانی کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔ عصمت نے جہاں طبقاتی کشمکش، چار دیواری میں جکڑی عورت، نواب زادوں کی عیش پرستی، معاشرتی ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کی ہے وہیں واقعہ کربلا جو ظلم کے خلاف حق کا استعارہ ہے اس کو موضوع بنا کر حق کی خاطر شہید ہونے والوں کے ذریعے محبت اور حق اور انصاف پسندی کا جذبہ اجاگر کرنے کی کوشش ہے

جس کی ضرورت ہر عہد میں ہے۔اس ذیل میں خود عصمت چغتائی رقم طراز ہیں :

یہ ان بہتر انسانوں کی کہانی ہے جنھوں نے انسانی حقوق کی خاطر سامراج سے ٹکر لی۔یہ چودہ سو سال پرانی کہانی آج کی کہانی ہے کہ آج بھی انسان کا سب سے بڑا دشمن انسان کہلاتا ہے۔ آج بھی انسانیت کا علمبر دار انسان ہے۔ آج بھی دنیا کے کسی کونے میں کوئی پرندہ سر اٹھاتا ہے تو حسین بڑھ کر اس کی کلائی مروڑ دیتے ہیں۔ آج بھی اجالا اندھیرے سے بر سر پیکار ہے۔(۹)

عصری معنویت کا حامل ناول "ایک قطرہ خون" عصر حاضر کی غمازی کرتے ہوئے اور حالات کے ساتھ ناانصافی پر انصاف اور باطل پر حق کی فتح اور کامیابی کی ہمت دلاتا ہے۔سامراجی قوتوں کے خلاف صدا بلند کرنا کربلائی عنصر ہے، جسے عصمت چغتائی نے بھی اس کہانی کو پیش کر کے اپنے عہد کے لوگوں کو موومنٹ عطا کی ہے۔

حسین الحق کا ناول "فرات" تشنہ لب انسانیت کے لیے بطور استعارہ معاشرتی قدروں کی پیچیدگیوں کو پیش کرتا ہے۔ تہذیبوں کے ٹکراؤ، سیاست اور تہذیب و ثقافت کو پیش کرنے کے لیے ہمہ گیر علامت کا استعمال کیا ہے جس کے کنارے آج بھی انسانیت تشنہ لب کھڑی ہے اور کسی نئی کرب وبلا میں گرفتار ہے۔

کوفے کے بازار میں ----ظالم کے دربار میں----
ایک کٹا ہو سر----ایک تنی ہوئی گردن----
آنسوؤں سے لبالب----مگر عزم اور حوصلے سے----
بھرپور آنکھیں ----رجز کی آواز پھر سنائی دی----
بڑھو بیٹی بڑھو!
گھوڑوں کے سموں سے اٹھنے والی چنگاریاں
تمہاری راہ کا چراغ بنیں
یہ بہار کی آخری شام ہے
زمین وفا پر بکھرتے سروں کے پھول تمہاری نذر ہیں
بڑھو بیٹی بڑھو!
بڑھو بیٹی بڑھو!! (۱۰)

گویا ہر عہد میں انسان جب بھی جبر سے دوچار ہوا ہے اور سچائی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے تو اُسے تشبیہِ کربلا سے گزرنا پڑتا ہے۔اس ناول میں بھی واقعہ کربلا کو موضوع بنا کر کہیں سیدنا امام حسین کے کردار،

کہیں بی بی زینب کے کردار، کہیں واقعات کربلا سے جڑی ہماری ثقافتی روایات، رسوم، عقائد، اقدار، تمام کربلائی عناصر کو پیش کیا گیا۔ جمیلہ ہاشمی بھی اپنے ناول "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" میں واقعہ کربلا کی تمثیل پیش کرتے ہوئے اور کربلائی کرداروں کے مکالمات اور سوگوار واقعات سے فضابندی کرتی ہوئی کی ناول کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ اردو کے دیگر ناولوں میں بھی کربلا سے جڑے موضوعات اور اقدار کو ناول نگاروں نے جزوی صورت موضوع بنایا ہے۔

مذہب اور ادب دونوں ہی انسانی زندگی اور انسانی اقدار سے جڑے ہوئے ہیں۔ عمومی طور پر مذہبی نظریات ہمارے شعور میں رچے بسے ہوتے ہیں اور وہ براہ راست ادب میں اظہار پا جاتے ہیں اور کبھی واقعات، علامتوں اور کرداروں کی صورت میں ادب میں نمو پاتے ہیں۔ واقعہ کربلا جہاں دیگر اصناف ادب کا حصہ ہیں، وہیں اس واقعے نے اردو افسانے کو بھی مالا مال کیا ہے۔ اردو کا افسانہ نگار کسی بھی زمانے، مذہب یا مکتبہ فکر کا ہو وہ اس واقعے سے متاثر نظر آتا ہے۔ اس واقعے کو پڑھنے، سننے، جاننے کے بعد انسانی المیے کے جس تجربے سے وہ گزرتا ہے، اس تجربے کو تخلیقی رنگ دے کر کہانی کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

پریم چند، مختصر افسانہ نگاری کے بنیاد گزاروں میں شامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں مرکزی قدر باطل کے خلاف مزاحمت، ظلم و استحصال کے خلاف آواز اور مظلوم کے حقوق کی بات کرنا ہے۔ حق پرستی، جبر اور استحصال ان کے افسانوں کے مرکزی موضوع ہیں۔ حق کوشی، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا ہی کربلائی قدریں ہیں۔ سیدنا امام حسین نے اصولوں کی بنیاد پر ہی اس معرکہ کو فتح کیا اور ایثار، قربانی اور وفا کا درس دیا دیتے ہیں۔ یہ ثابت کیا ہے کہ حق اور باطل کے معرکے میں فوج کی تعداد اہم نہیں ہے۔ فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ پریم چند کے افسانے "رانی سارندھا" کے کردار سے شریکۃ الحسین جیسی شیر دل خاتون عقیلہ بنی ہاشم سیدہ بی بی زینب کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ جنھوں نے سرزمین کربلا اور کربلا سے شام تک ہر مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اپنے خطبات کے ذریعے انقلاب حسینی کو امر کر دیا ہے۔ سیدہ زینب تاریخ اسلام کا ایک انقلاب آفریں کردار ہے جو ہر عورت کے لیے مشعل راہ ہے۔ افسانہ میں "رانی سارندھا" پوری شجاعت سے اپنی جنگ لڑ رہی ہے اور دشمنوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر نے اپنے افسانے "معجزہ" میں علمدار کربلا کے علم کو حق کے استعارے کے طور پر برتا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں گورکی کی طرح انقلاب برپا کرنے کی خواہش نظر آتی ہے اور غلامی سے نجات دلا کر لوگوں کو آزاد دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ نئی سوچ کو پروان چڑھانا چاہ رہے ہیں۔ نئے امکانات

دکھانے کے خواہش مند ہیں۔ جس طرح وہ اپنے افسانے "یزید" میں مروجہ رویوں سے اختلاف رکھتے ہوئے جو ایک نئے یزید کو جو پانی کو بند کرنے والا نہیں بلکہ پانی کی بندشوں کو دور کرنے والا ہو، دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ "کالی شلوار" میں کربلا کی ثقافتی تشکیل اور رسم ورواج کو طوائف سلطانہ کی حسرتوں کے پردے میں دکھایا ہے کہ وہ کیسے محرم کے تقاضے پورا کرنا چاہ رہی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں تاریخ اور تہذیب کو موضوع بنا کر افسانے لکھے گئے ہیں۔ ''جلاوطن'' میں تہذیبی و ثقافتی سرگرمیاں جو برصغیر کے مشترکہ رسم ورواج جہاں ہندو اور مسلمان بغیر کسی تفرقہ بازی کے تہواروں میں شرکت کرتے تھے۔ باہمی میل جول کی تصویر کشی ہے تو وہیں محرم الحرام کی مناسبت سے ٹوٹتی اور بکھرتی تہذیب کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ واقعہ کربلا سے جڑت اور ان کے کرداروں سے عقیدت کے طور پر افسانہ نگاروں نے منتوں اور مرادوں، اعتقادات کو موضوع بناتے ہوئے افسانے لکھے ہیں۔ سیدنا امام حسین اور علم غازی سے اپنی حاجات کی برآوری کے لیے توسل کرنا شیعہ ثقافت کا حصہ ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں ان کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اساطیر و دیومالا کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ عصری دور کے پرفتن دور بیان کرنے کے لیے کربلا کے استعاروں کے ذریعے جگہ جگہ کربلا ہی دکھائی دے رہی ہے۔ اور اس (یہ غازی تیرے پراسرار بندے) پورے افسانے کو اسطوری قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔

> افق پر سنسان میموں کے پردے باد سموم میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ سارے میں جلی ہوئی رسیاں اور جلے ہوئے پردے اور بچوں کی ننھی سی جوتیاں بکھری پڑی تھیں۔ بہت دور فرات بہہ رہا تھا۔ اس کے کنارے ایک گھوڑا زور سے ہنہنایا اور کسی نے بڑی کرب ناک آواز میں پکارا۔ العطش العطش۔۔۔۔
>
> پھر ایک لرزہ چیخ بلند ہوئی۔ العطش۔
>
> اچانک سورج کی روشنی بہت تیز ہو گئی۔ تباہ شدہ خیمہ گاہ اب صاف بہت قریب نظر آ رہی تھی۔(۱۱)

قرۃ العین حیدر کو انسان کی غیر فطری موت اور جنگ کی تباہ کاریوں کو دیکھ کر ہر زمین ہی کربلا دکھائی دے رہی ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد لکھتے ہیں :

> "یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے" میں عصری صورتحال کو کربلا کے رمزی استعارے سے یوں ملایا ہے کہ ہر زمین کربلا دکھائی دیتی ہے۔ یوں اسطوری جہت کی شمولیت سے افسانہ

> با معنی ہو گیا ہے۔ انسان جب سے اس دھرتی پر آیا ہے قربانی کے لامتناہی سلسلے سے گزر رہا ہے۔ قربان ہونے والا بھی انسان ہے اور قربان کرنے والا بھی۔ ہابیل اور قابیل کی لڑائی کربلا پر ختم نہیں ہوئی۔ نصرت الدین امام قلی اور تمہارا اگرین برگ فیلڈنگ جو ایک دوسرے کو اپنا تعارف کراتے ہوئے اس بات پر ہنس پڑتے ہیں کہ " اولاد آدم کا شجرہ بہت گنجلک ہے" اسی عصری کربلا کے کردار ہیں۔(۱۲)

ممتاز شیریں بھی کربلائی رویوں کو افسانوی فن کا موضوع بنا کر تاریخ کے اس واقعے سے متعلق اہم سوالات اٹھاتی ہیں۔

اپنے اسلوب اور موضوعات کی بنا پر فکشن میں اپنی الگ راہ بنانے والے افسانہ نگار انتظار حسین کے ہاں سب سے زیادہ کربلائی عناصر کو برتا گیا ہے۔ علم ، بوتراب، تسبیح خاک شفا، خون حسین، علم و ذوالجناح یہ تمام استعارے اس تہذیب کے نمائندہ ہیں جو تہذیب اب بھولی بسری یاد بن چکی ہے۔ انھی استعاروں کی مدد سے انتظار حسین اپنی تہذیب کی بازیافت کرتے ہیں۔ آخری موم بتی میں ویران امام باڑے کے ذریعے پوری تہذیب کے اجڑنے کا نوحہ بیان کیا گیا ہے۔ ”سیڑھیاں“ میں بھی ماضی اور خواب کی حدیں آپس میں مل رہی ہیں، شیعی گھرانے کے اعتقادات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ عزاخانے، مجالس، محرم کے زوال کے سبب، پرانی روایتوں ، قدروں اور انسان کے اخلاقی زوال کو پیش کرتے ہیں۔ ”مردہ راکھ“ میں بھی غائب ہو جاتا ہے، متولی دُنیادار ہو گئے ہیں اور علم کو گروی رکھ دیا جاتا ہے۔ گویا جہاں انسان اپنی شناخت گم کر چکا ہے وہیں اس اجتماعی شعور ، رسم و رواج کو جو ان کے ماضی کے ورثہ تھے، مجالس ، عزاخانوں، علم، خون حسین ان استعاروں کو تخلیقی قوت بنایا ہے۔ مٹی کے ان حوالوں کو یاد کر کے ہجرت کے کرب کے ساتھ ساتھ انتظار حسین زمانہ حال کے لوگوں کے رویوں پر نالاں ہیں۔ محرم برصغیر کی تہذیب کا استعارہ ہے۔ انتظار حسین اس سے جڑی ہوئی علامتوں، علم اور ذوالجناح کو صلیب سے بھی بڑی علامتیں قرار دیتے ہوئے ادب میں نئے امکانات وا کرنا چاہ رہے ہیں۔

افسانہ "انتظار" میں بھی امام زمانہ کی آمد کی اساطیر بنتی ہے وہ تجارت کے عام طریقوں سے احتراز برتتے ہوئے مزاحمت نہیں کرتے بلکہ ظہور مہدی کا انتظار کرتے ہیں۔ امام مہدی کا ظہور اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔ جب فسق و فجور سے دنیا بھر جائے گی تو امامِ زمانہ سیدنا امام مہدی علیہ السلام قیام کریں گے اور بھی بیشتر افسانوں میں وہ ہجرت کے تجربے کو کوفہ و کربلا کی اذیتوں سے گزار کر اپنے افسانوں میں

پیش کرتے ہیں۔ اس لیے انتظار حسین کے افسانوں کا گہرا مطالعہ کرتے مذہبی عقائد کے ساتھ جذبات واحساسات بھی مد نظر ہوں گے۔ تب ہی فن پارے کی تفہیم ممکن ہے۔ انھی پانچوں موضوعات کو مد نظر رکھیں تو انتظار حسین کی الگ شناخت بنتی ہے۔ وہ روایتی روش سے ہٹ کر مختلف موضوعات ورجحانات کے تحت افسانے لکھتے رہے ہیں۔ جن میں تہذیبی شخصیت کی بازیافت میں نظروں سے دور ہوتے، شہروں، گلی کوچوں، مجلسوں، امام باڑے، عقائد، توہمات، رسم و رواج کو گرفت میں لاتے ہیں۔ وہ اسلامی اساطیری روایتوں، ہندو دیومالا، جاتک کتھائیں، ملفوظات، قصص وروایات کے دریچوں سے اخلاقی اقدار کی شکست وریخت، ذہنی انتشار، معاشرتی وتہذیبی رشتوں کے زوال اور ان کے کرب کو محسوس کرتے ہیں۔ تقسیم اور اس سے پیدا شدہ مسائل فسادات اور سیاسی وسماجی حالات کو موضوع بناتے ہیں۔ کبھی کربلا، کوفہ، مکہ، مدینہ، ابن زیاد اور امام زمانہ کے ذکر سے افسانے کے لیے ایسی فضا تیار کرتے ہیں، جس میں ناگزیر کربلائی پس منظر ابھرتا ہے۔ ”خواب اور تقدیر“ اپنے اپنے عہد کا آشوب نامہ ہے اور یہ براہ راست واقعہ کربلا کے تاریخی واقعے کو پیش کر رہا ہے۔ جب نعمان بن بشیر حاکم کوفہ تھا۔ سیدناامام حسین نے اہل کوفہ کے استفسار پر حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا کہ وہ لوگوں سے بیعت لے تو خواہان بنی امیہ نے دیکھا کہ نعمان بن بشیر کا رویہ قدرے صلح جو اور سلامتی پسند ہے، اور جو وہ کوفہ کے منبر پر تقریر کر رہے تو بنی امیہ کے حلیف عبداللہ بن مسلم بن حضرمی نے صاف کہہ دیا کہ یہ رویہ ٹھیک نہیں سوائے ظلم وزیادتی کے اصلاح نہیں ہو سکتی اور یہ کمزور لوگوں کا شیوہ ہے جس طرح کا رویہ آپ کا دشمن کے ساتھ ہے۔ نعمان بن بشیر نے جواباً کہا:

> اگر میں اطاعت خدا میں کمزور لوگوں میں سے ہوں تو یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس لیے کہ میں معصیت خدا کے ساتھ معززوں میں شمار ہو جاؤں۔(۱۳)

پھر خواہان بنی امیہ نے یزید کو خط لکھ بھیجا کہ کوفہ میں کسی طاقتور آدمی کو مقرر کرو۔ پھر نعمان بن بشیر کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر دیا اور ابن زیاد کو مقرر کر دیا۔ ادھر اہل کوفہ کو سیدناامام حسین کی آمد کی خبر موصول ہو چکی تھی وہ آپ کے منتظر تھے۔ جس کا ذکر انتظار حسین ”خواب اور تقدیر“ میں یوں کرتے ہیں:

> وہ شخص گھوڑے پر سوار سیاہ عمامہ پہنے منہ پر ڈھاٹا باندھے، ڈھال تلوار زیب کمر کیے شہر میں داخل ہوا۔ لوگ سمجھے امام زماں کا ورود ہوا، گلی گلی کوچے کوچے یہ خبر پھیلی۔ لوگ مسرور ہوئے امام کے تصور سے مسحور ہو کر مرحبا کہتے گھروں سے نکلے اور اس کے گرد

اکٹھے ہوئے۔ قصر الامارہ کے اونچے دروازے پر پہنچ کر اس نے گھوڑے کی باگ کھینچی اور مجمع کی طرف رخ کیا۔۔۔ نیام سے شمشیر نکالی اور کڑک کر کہا، اے لوگو تم میں سے جو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں آ گیا ہوں۔(۱۴)

ہر طرف سناٹا چھا گیا اور کوفہ کی فضا صبح تک بدل گئی۔ اب پہلے والا کوفہ نہیں رہا تھا۔ گویا خوف کا صحرا بن چکا تھا۔ جتنا اس میں رہنا مشکل تھا اتنا ہی اس سے نکلنا کیوں کہ کوفہ مثل چوہادان بن گیا تھا۔ چار ناقہ سوار شہر بے وفا سے نکل شہر امن کی جانب چل پڑے۔ یہ ناقہ سوار امن کی تلاش کے لیے رات کی تاریکی میں نکلتے ہیں تا کہ کوئی دیکھ نہ لے لیکن جب صبح تڑکا ہوا تو دیکھتے ہیں سامنے پھر کوفہ کی در و دیوار نظر آ رہی ہیں۔ اسی سوچ میں پڑ گئے ہیں شاید قدرت کو یہی منظور ہو کہ ہم اس شہر خراب میں ہی رہیں کیوں کہ اب واپسی بھی ممکن نہیں۔ پہرے داروں نے ہمیں دیکھ لیا ہے:

ہارون بن سہیل نے ٹھنڈا سانس بھرا "درست کہا کوفہ ہماری تقدیر ہے" اور منصور بن نعمان الدیدی بھی افسردہ ہو کر بولا کہ "ہاں مکہ ہمارا خواب ہے۔ تقدیر ہماری کوفہ ہے۔(۱۵)

کہانی جبر کے دائرے کے گرد گھوم رہی ہے اور انسان اس جبر کا ازل سے شکار ہے۔ اس افسانے کے بارے میں شہزاد منظر لکھتے ہیں:

یہ افسانہ بلاشبہ اس عہد کا بہت ہی اہم افسانہ ہے جو نہ صرف آج کے دور کی بلکہ ہر دور کی کہانی ہے۔ اس افسانے میں ہمارے عہد کے جبر کو نہایت خوبصورتی اور فن کاری سے علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ جبر کے ایک ایسے دائرے کے بارے میں ہے جس سے نکلنا شاید انسان کی تقدیر میں نہیں ہے۔ انسان بار بار جبر کے خلاف جدوجہد کرتا ہے بعض دفعہ وہ ظاہری طور پر کامیاب ہو بھی جاتا ہے، پھر اسے معلوم ہوتا ہے وہ اسی کوفے میں محصور ہے جس سے نکل کر وہ مدینے جانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ انتظار حسین نے اس مختصر افسانے میں پوری انسانیت کی تاریخ رقم کر دی ہے۔ اس انسان کی تاریخ جو ازل سے جبر واستبداد کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے جو شائد ابد تک جدوجہد کرتا رہے گا۔(۱۶)

اس افسانے کو عصری سیاست کے حوالے سے دیکھیں۔ نعمان بن بشیر جیسے صلح جو کو معزول کر کے ابن زیاد کا تقرر آج کی سیاست کا بھی حصہ ہے۔ آج کا انسان اپنی شب تاریک کو سحر کرنا چاہ رہا ہے لیکن وہ اسی شب تاریک میں زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

دیگر کئی افسانہ نگاروں نے کربلائی عناصر کو نئے منظر نامے کے ساتھ جوڑ کر عصری حالات کو پیش

کرنے کی کوشش کی ہے۔ خالدہ حسین، بانو قدسیہ وجودی مسائل کے حل کے لیے غم حسین کا سہارا لیتی ہیں۔ اسد محمد خان ہوں یا رشید امجد، یا پھر سریندر پرکاش، زاہدہ حنا، حسین الحق، آصف فرخی، رضوان احمد، علی اکبر ناطق، سب کربلا کے حوالے سے تاریخی صداقتوں کے ذریعے عصری صداقتوں کو پیش کرتے ہیں۔ اسلم جمشید پوری کربلا کے پیاسے شہیدوں کی پیاس کو یاد کر کے پانی اور پیاس کے رشتے کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ منظر کاظمی، عذرا نقوی، کربلا، شہادت امام حسین اور محرم الحرام کی مناسبت سے معاشرے کی بدلتی قدروں پر سوال قائم کرتے ہیں۔ علی حیدر ملک، مبشر زیدی، حق و باطل کے درمیان معرکے میں حق کا ساتھ دینے پر ہمیشہ مشکلات سے دوچار ہونے اور حق کی سربلند کے لیے جان دینے کو ہی مستند احتجاج سمجھتے ہیں۔ اردو افسانے کی روایت کا مجموعی جائزہ لیں تو کربلا اور کربلائی کردار و عناصر کی پیش کش مرکزی موضوع کے طور پر سامنے آتی ہے۔ کہانی کے ہر روپ میں چاہے داستان ہو ناول، افسانہ سب میں واقعہ کربلا کی ترجمانی ملتی ہے۔ کہانی ہی ایک اور صورت ڈراما ہے۔ اگرچہ کہانی ان چاروں اصناف میں مشترک پہلو ہے مگر پہلی تینوں اصناف اور ڈراما میں پیش کش اور تکنیک کا فرق موجود ہے۔ پہلی تینوں اصناف میں کہانی مصنف کی زبانی پیش کی جاتی ہے جبکہ ڈرامے میں کردار اپنی گفتگو اور عمل اور مکالموں کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ واقعہ کربلا نے جہاں باقی اصناف کو متاثر کیا وہیں اردو ڈراما میں بھی کربلا کو موضوع بنایا گیا ہے۔

پریم چند جو بنیادی طور پر افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ انہیں بطور ڈراما نگار وہ پذیرائی اور شہرت حاصل نہ ہوئی جو بحیثیت افسانہ نگار اور ناول نگار کے ملی۔ پریم چند نے چار طبع زاد اور پانچ ڈرامے تراجم کیے ہیں۔ پریم چند کے طبع زاد اُردو ڈراموں میں "کربلا" پہلا ڈراما ہے۔ موضوع کے لحاظ سے بھی یہ اپنی نوعیت کی پہلی اور انفرادی کاوش ہے۔ پریم چند ہندو ہونے کے باجود سیدنا امام حسین سے عقیدت رکھتے تھے اور وہ واقعہ کربلا اور سیدنا امام حسین کو محافظ بشریت، محسن انسانیت سمجھتے ہیں۔ انھوں نے سیدنا امام حسین اور کربلا کو موضوع بنایا اور مذہب سے زیادہ انسانیت کے رشتے کو تقویت دی۔ یہ امر اگرچہ بذات خود ایک قابل بحث موضوع ہے۔ وہ اس سلسلے میں اپنے دوست دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں:

> میں نے حضرت حسین کا حال پڑھا ان سے عقیدت ہوئی۔ ان کے ذوق شہادت نے معنون کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ڈراما تھا۔(۱۷)

گویا کربلا نے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کو متاثر کیا بلکہ انسانی بنیادوں پر دیکھیں تو کربلا کے اثرات کس شدت سے پڑے کہ ہندو بھی اپنی عملی اور تخلیقی زندگی میں کربلائی رویوں اور اقدار کو اپنانا پسند

کرتے ہیں۔ پریم چند نے جس طرح واقعہ کربلا کو پیش کیا حسن عقیدت کا مظہر ہے۔ اس تناظر میں اس ڈرامے کی سماجی معنویت بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ حسین امن عالم کا استعارہ ہے اور پریم چند کے بھی لکھنے کا مقصد دونوں مذاہب کے درمیان مذہبی تناؤ کا ختم کرنا تھا یعنی محض خراج عقیدت پیش کرنا مقصد نہیں تھا بلکہ سیدنا امام حسین کو بطور امن، محبت کی علامت بنا کر مفاہمت پیدا کرنا تھا۔ کربلا ڈرامے کے دیباچے میں بھی پریم چند ہندو دھرم کے ماننے والوں سے گزارشات پیش کرتے ہیں کہ وہ دینی بزرگوں کو قریب سے مشاہد کریں، باہمی چپقلش ختم کرکے دشمنی کو دوستی میں بدلیں۔ ڈرامے میں حق اور باطل اور خیر وشر کی زبردست قوتوں کے درمیان ٹکراؤ کو جس طرح پیش کیا ہے ایک طرف سیدنا امام حسین اور ان کے ساتھ راست گو، باکردار، خوش اخلاق، نیک سیرت اور دوسری طرف یزید اور اُس کے ساتھی مفاسد کے نمائندے ہیں، معاش پرست ہیں۔ ابن زیاد کی طرف سے جب کوفے سے قاصد آتا ہے تو پیغام لے کر چند جملے یہاں درج کرتے ہیں:

یزید: کیا پیغام لایا ہے؟

قاصد: ابن زیاد نے گزارش کی ہے یہاں کے لوگ حضور کی بیعت قبول نہیں کرتے اور بغاوت پر آمادہ ہیں اور حسین ابن علی کو اپنی بیعت لینے کے لیے بلا رہے ہیں۔ تین قاصد جا چکے ہیں مگر حسینؓ ابھی آنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ اب شہر کے کئی رئیس خود جا رہے ہیں۔

یزید: ابن زیاد سے کہو جو آدمی میری بیعت نہ منظور کرے اسے قتل کر دو مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

رومی: دشمن کے ساتھ مطلق رعایت کی ضرورت نہیں۔ ابن زیاد کو چاہیے کہ تلوار کے استعمال میں دریغ نہ کرے۔

حُر: مجھے خوف ہے بغاوت ہو جائے گی۔

رومی: سزا اور سختی ہی حکومت کے دو گر ہیں میری عمر ملک داری میں ہی گزری ہے ۔۔۔۔(۱۸)

حکومت کی آڑ میں نہ خوف خدا ہے اور نہ خوف رسول جس کا نتیجہ یہ حق و باطل کا معرکہ تھا اور آخر حق کی فتح ہوتی ہے۔

"تمانچہ بر خسار یزید" بھی حسن نظامی کی ڈراما نما تاریخی کہانی ہے۔ اور دہلی میں شیعہ جماعت کی

طرف سے اس کا سٹیج ڈراما بھی کیا گیا ہے۔ اٹھارہ ابواب پر مشتمل یہ ڈراما "حضرت علی کے پوشیدہ کاغذ" سے شروع ہو کر "تمانچہ بر خسار یزید" پر ختم ہوتا ہے۔ ایک طرف اس ڈراما میں یزید اور ابن زیاد کے اعمال وافعال اور ان کی خانگی زندگی کے معاملات کہ جہاں انسان جانوروں کی طرح انسانی رشتوں ماں، باپ، بہن، بھائی کی تمیز سے ماورا ہو کر اپنی چاہت کی لطافت کے لئے کائناتی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ اگر سیاسی، سماجی سطح پر دیکھیں تو دنیا پرستی، اور سفاکی حکومت حاصل کرنے کی کوشش ایسے جاری تھی کہ خدا کا حکم ماننے سے انکاری ہے۔ اور دوسری جانب خاندان بنی ہاشم جو قرآنی تعلیم اور دین اسلام کو سمجھنے سمجھانے اور پھیلانے میں مصروف عمل ہیں۔ یعنی خیر و شر کو باہم متصادم دکھایا گیا ہے اور اس خیر اور شر کے متصادم رویئوں کی افسانوی رنگ میں پیشکش کا ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ یہ تاریخی ڈراما آج بھی ہر باضمیر اور حق شناس کی سوچ کو نئے زاویے عطا کرے گا۔ جیسے کہ آخری باب میں ریحانہ کا یزید کو نفرت کا تمانچہ مارنا صرف ایک ریحانہ کا ہی نہیں بلکہ تاریخ کا ہاتھ ہمیشہ یزید اور اس جیسے سیاہ کاروں کے چہروں پر اپنے نشان ثبت کرتا رہے گا۔

> یزید۔ تمہیں کیا ہو گیا امینہ۔ یہ تم ایکا ایکی دیوانی کیوں ہو گئیں۔
>
> امینہ۔ اے یزید میں دیوانی نہیں ہوئی ہی۔ خوب ہوشیار ہوں۔ مجھ کو اپنے آقا و مولا سید حسین ابن علی کے ذکر سے جوش آ گیا۔
>
> یزید۔ کیا تو حسین کی ماننے والی ہے۔
>
> ریحانہ۔ ہاں میں مالک ابن اشتر کی بیٹی ریحانہ ہوں۔
>
> یزید یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ اور ایک ہی دفعہ جھلا کر کھڑا ہوا تا کہ ریحانہ پر حملہ کرے۔ اور پہرے داروں کو پکارے۔
>
> ریحانہ یہ دیکھتے ہی جھپٹی اور آگے بڑھ کر یزید کے رخسار پر ایک تمانچہ مارا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر لیا۔(۱۹)

جعفر طاہر کا منظوم ڈراما "عراق" بھی براہ راست واقعہ کربلا کی تاریخی کہانی کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔ جس میں کوفہ میں ابن زیاد کی آمد، کوفہ کی بے وفائی، امیر مسلم بن عقیل کی شہادت، میدان کربلا، شام غریباں کی منظر کشی اور بی بی زینب کے خطبے کو دردناک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس میں وہ اہل کوفہ کی سیدنا امام حسین سے بے وفائی پر سرزنش کرتی ہیں :

حضرت زینب عالیہ:- کہو کہو ساکنان کوفہ !
کہو کہ تم میرے پاک نانا کی امت محترم نہیں ہو؟
کہو کہ اسلام پر نہیں ہو؟
کہو کہ اس دین پر نہیں ہو جو دین ہم نے تمہیں دیا ہے؟
کہو تمہارا خدا کوئی اور ہے؟
نبی اور ہے؟ (۱۰)

امام علی کے لہجے میں یہ دیے گئے عقیلہ بنی ہاشم بی بی زینب کے خطبات نہضت حسینی کو جاری رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ گویا کربلا کی کہانی ڈراما میں بھی لفظوں کے نئے نئے روپ دھار کر سماجی، عصری تقاضوں اور ضرورتوں کے تحت جنم لے رہی ہے۔

مجموعی جائزہ لیا جائے تو واقعہ کربلا فکشن کی ہر صنف میں موضوع بنتا نظر آئے گا۔ چاہے مرکزی قدروں، حق و باطل، خیر و شر کی کشاکش ہو، مہر و عطوفت کا عنصر ہو یا عزت و حماسہ، شجاعت و شہامت، پیمان وفا، محبت، خلوص، ہمدردی ہر طرح سے ان کا اظہار تخلیق کاروں نے کیا ہے۔ علامتی و استعاراتی اظہار بھی ملتا ہے۔ کربلا کی ثقافتی تشکیل، محرم الحرام، رسوم و رواج، عزاداری کو موضوع بنا کر بھی فکشن کی ہر صنف میں لکھا گیا ہے اور جہاں بھی ظلم کی داستان رقم ہوتی ہے کہانی کاروں نے اس صورت حال کو واقعہ کربلا سے جوڑ کر نئی معنویت سے قاری اور سماج کو آگاہ کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) نسیم نکہت، اردو شاعری میں واقعات کربلا (لکھنو: نظامی پریس، ۲۰۱۳ء)، ۳۵۔

(۲) قمر الہدیٰ فریدی، اردو داستان تحقیق و تنقید (بار اول ۱۹۹۱ء)، ۱۸۱۔

(۳) رجب علی بیگ سرور، فسانہ عجائب (اراکین مجلس ادبیات عالیہ، نومبر ۲۰۲۰ء)، ۲۵۔

(۴) ایضاً، ۱۹۸۔

(۵) شمس الرحمن فاروقی، ساحری، شاہی صاحب قرآنی، جلد سوم (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، طبع اول ۲۰۰۰ء)، ۱۸۰۔

(۶) مرزا امان علی خاں غالب لکھنوی، داستان امیر حمزہ (کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، پہلی اشاعت ۲۰۱۱)، ۱۹۰۔

(۷) یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اُردو ناول (حیدر آباد: نیشنل بک ڈپو، ۱۹۶۳)، ۹۔

(۸) رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد اول (نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، ۱۹۸۰)، ۲۰ ۔

(۹) عصمت چغتائی، ایک قطرہ خون (پیش لفظ)، صابر دت، ۱۹۶۲ء

(۱۰) حسین الحق، فرات (دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۲)، ۲۸۔

(۱۱) قرۃ العین حیدر، یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے، مشمولہ روشنی کی رفتار (علی گڑھ: ایجو کیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، ۱۲۱ ۔

(۱۲) ڈاکٹر قاضی عابد، اُردو افسانہ اور اساطیر (مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء)، ۲۶۲۔

(۱۳) سید علی حیدر طباطبائی، ترجمہ: تاریخ طبری (جلد چہارم) (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۲۰۰۲)، ۱۵۲۔

(۱۴) انتظار حسین، خواب اور تقدیر مشمولہ مجموعہ انتظار حسین (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء) ۶۰۶۔

(۱۵) ایضاً، ۱۱ ۔

(۱۶) شہزاد منظر، جدید افسانہ اور عصری آگہی مشمولہ جدید اردو افسانہ (کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۸۲ء)، ۸۲۔

(۱۷) مدن گوپال، پریم چند کے خطوط (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۶)، ۱۰۱۔

(۱۸) پریم چند، کربلا (دہلی: لاجپت رائے اینڈ سنز، ۱۹۲۲)، ۳۹۔

(۱۹) خواجہ حسن نظامی، تمانچہ بر خسار یزید (دہلی: دفتر خواجہ حسن نظامی، ۱۹۵۲ء)، ۱۱۴۔

(۲۰) مجلہ قند، شمارہ نمبر ۲، ۳ خصوصی ڈراما نمبر، ایڈیٹر تاج سعید، (پریمیر شوگر ملز اینڈ انڈسٹری کمپنی لمٹیڈ، مردان، ۱۹۹۱) ص: ۲۰۱

❖❖❖